محمد حسن کا تنقیدی وِژن

(''دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر'' کی روشنی میں)

پروفیسر محمد حسن جتنے بڑے محقق تھے اتنے ہی بڑے تخلیق کار اور ناقد بھی۔ تحقیق، تنقید اور تخلیق کا اتنا گہرا امتزاج اردو ادب میں کم ہی نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کو کسی ایک خانے یا چوکھٹے میں قید نہیں رکھا، یہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کی روشن علامتیں ہیں جن کی وجہ سے محمد حسن ادب کا نیّرِ اعظم بن گئے۔ مارکسیت ان کی کمزوری ضرور تھی مگر انہوں نے آنکھ بند کر کے تنقید کے کسی بھی نظریہ کو اختیار نہیں کیا ہے۔ وہ کھلے ذہن کے انسان تھے اور ادب کے بدلتے رویے اور رجحانات پر ان کی نظر گہری تھی۔ انھوں نے اپنی تنقید کی اساس گہرے مطالعہ پر رکھی تھی اس لیے وہ ادب کے تجربہ میں عام نقادوں کی روش سے مختلف راہ اپناتے تھے۔ وہ سائنسی طریق کار کے قائل تھے اس لیے ادب کا جائزہ سائنسی طریقہ سے لیتے تھے۔ محمد حسن کا خیال ہے کہ ادب کے عروج وزوال میں تہذیبی اور سماجی عوامل کارفرما رہتے ہیں لہٰذا اس کے عروج وزوال کے وجوہات کی تلاش تہذیبی اور سماجی عوامل کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تخلیقی عمل پیچیدہ عمل ہے اور اس عمل کے دوران بعض عوامل خاموشی سے اثر انداز ہوتے ہیں جنہیں تعین قدر کے وقت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

> ''تخلیق دراصل تین سطحوں سے ہوکر گزرتی ہے وہ اپنے مصنف کی ذات کا اظہار بھی ہوتی ہے۔ اس کے عصری شعور کی آواز بھی اور اس دور سے پیدا ہونے والی آفاقی اقدار کی گونج بھی۔ اس لیے ہر دور کے سنجیدہ ادب کا مطالعہ لازمی طور پر مصنف کا مطالعہ (تحقیق، سیرت اور نفسیات کی مدد) عصر کا مطالعہ (عمرانیات، اقتصادیات اور سماجی علوم سے) اور آفاقی اقدار کا مطالعہ جمالیات اور تاریخ کی مدد سے بن جاتا ہے۔'' (آج کل، جولائی 2010، ص-12-11)

ان خیالات کا اظہار ان کی مشہور کتاب ''دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر'' میں تفصیل سے ہوا ہے، جو کہ ان کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کی عمدہ مثال ہے، جس میں انہوں نے تہذی یا اقتصادی عوامل کی روشنی میں ادب کو پرکھنے کی ترغیب دی ہے۔ اس کتاب میں بعض جگہ مارکسی تنقید کی جھلک بھی ملتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ پوری طرح سے مارکسی تنقید کے حامی تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ متذکرہ کتاب کے شائع ہونے کے بعد ادب کا مطالعہ تہذیب کی روشنی میں کرنے کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا اور مختلف اصناف کا اب تک نہ جانے کتنے تہذیبی مطالعات پیش کیے جاچکے ہیں اور ہنوز کیے جارہے ہیں۔

اردو زبان وادب کے متعلق محمد حسن کا خیال ہے کہ یہ ہند آریائی دو تہذیبوں کا سنگم ہے۔ لیکن انہوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ان دونوں تہذیبوں کو ہندو اور مسلم تہذیبوں سے منسوب نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ مسلمان پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر ملک کی تہذیب ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے دنیا کے تمام مسلمانوں کے عقائد میں یکسانیت کے باوجود ان کی تہذیب مختلف ہے۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اردو کا فروغ ہندوستانی اور ترک ایرانی تہذیب کے اختلاط سے ہوا اور یہ دونوں تہذیبیں آریائی تہذیبیں تھیں جن میں نسلی مناسبت تھی اور ان میں مشترک اقدار کا ذخیرہ بھی موجود تھا۔ محمد حسن کا خیال ہے کہ ان تہذیبوں کے عقائد اور اقدار کے اثرات ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے بھلے ہی قبول نہ کئے ہوں لیکن ان کے

مزاج اور کردار کی تشکیل میں یہ روایات ضرور موجود رہی ہوں گی۔ اسی لئے محمد حسن نے ادب کا مطالعہ وسیع تر تہذیبی پس منظر میں کرنے پر زور دیا ہے کیوں کہ تہذیبی مطالعہ کے ذریعہ نسلی وراثت، معاشرت اور اس کی اقدار، معتقدات اور فلسفے، تاریخ اور سیاسیات، اقتصادیات وغیرہ کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے۔

محمد حسن کے مطابق اردو زبان ہند آریائی عناصر کی پروردہ ہے۔ محمد حسین آزاد کی کتاب ''سخن دانِ فارس'' اور ''دیباچۂ آبِ حیات'' کے حوالے سے انہوں نے قدیم فارسی اور سنسکرت کو مماثل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے عربی پر قدیم فارسی کی اصطلاحوں کو ترجیح دی ہے کیوں کہ یہ اصطلاحیں آریائی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں عربی لفظ صلواۃ کی جگہ عبادت، صوم کی جگہ روزہ، اللہ کی جگہ خدا، ملائکہ کی جگہ فرشتے اور جنت کی جگہ بہشت کہا اور لکھا جانے لگا۔ انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اردو ادب کے مزاج اور تہذیبی فضا نے قدیم فارسی کی اصطلاحوں کو ہی نہیں بلکہ تصورات، اقدار اور تہذیبی رویّوں کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا جس کا فطری اظہار تصوف کے آئینہ میں کیا گیا۔ اس لیے اردو کی صوفیانہ شاعری میں جو آزاد خیالی، وسیع المشربی اور رواداری پائی جاتی ہے یہ دراصل ایرانی اور ہندوستانی تصوف کے مشترکہ اقدار کی دین ہے۔

محمد حسن نے خانقاہوں کے سماجی رابطے، عوام پر ان کے اثرات اور تصوف کے بنیادی نظریات کو سمجھنے پر زور دیا ہے کیوں کہ انہیں سمجھے بغیر اردو شاعری کی اصطلاحوں اور اس کے سماجی مفہوم کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے تصوف کے فکری ماخذوں اور اس کی اصطلاحوں کی وضاحت مختلف مبصرین اور محققین مثلاً نکلسن، دوزی، وان کریمر، براؤن اور برنارڈ شا کے علاوہ مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، ذوالنون مصری، جنید بغدادی اور علامہ اقبال وغیرہ کے نظریات سے بحث کرتے ہوئے یونانی، نوافلاطونی، ویدانتی، بدھ مت کے فلسفے اور اسلامی تصوف کے نکات پر جس طرح عالمانہ روشنی ڈالی ہے اور صوفی تحریک کی نشو ونما میں ایران اور آریائی نسل سے گہرا تعلق رکھنے والے عالموں اور مفکروں کی خدمات کو اوّلیت دی ہے، اس سے ان کے تحقیقی اور تنقیدی وژن کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے تصوف کی نشو ونما میں شریعت اور طریقت کے نظریوں کو زیر بحث لا کر تصوف کی اصل روح تک رسائی حاصل کی اور اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ تصوف کی کن خوبیوں کی بنا پر عوام سے اس کا گہرا رشتہ قائم ہوا۔ انہوں نے عوام اور صوفیوں کے درمیان کے رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ صوفیوں نے اپنے افکار و نظریات کو عوام کی زبان میں عوام تک پہنچانے کی کوشش کی جس سے اردو کے رسائل و جرائد اور ان کی تصنیفات نظم و نثر کی صورت میں شائع ہوئیں۔ انہیں صوفیوں کے بنیادی افکار و نظریات کی وجہ سے اردو غزل میں آزاد خیالی، وسیع المشربی کی روایت عام ہوئی۔ صوفیوں نے معرفت کے منازل و مراحل کے اظہار کے لیے جن اصطلاحوں کو وضع کیا وہ سب اردو غزل میں استعمال ہونے لگیں۔ اردو غزل میں ایثار و قربانی، خود فراموشی اور عشق و محبت کے جو پاک جذبات پائے جاتے ہیں وہ بھی تصوف کی ہی دین ہیں۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر محمد حسن نے لکھا ہے:

> ''تصوف نے اردو شاعری کے لیے فکری سطح پر مدنی مرکزیت کی وہ بنیاد فراہم کر دی جس پر ہندوستانی اور مغربی اور وسط ایشیائی معاشرے اور افکار و اقدار اشتراک تلاش کر سکتے تھے اور نئی تہذیب کا فکری جواز پا سکتے تھے۔'' (دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر، ص-48)

وسط ایشیا کے مختلف قبیلوں کے ہندوستان اور ایران آنے اور ایک دوسرے کی تہذیب و روایت اور اقدار کے اثرات قبول کرنے نیز موہن جوداڑو اور ہڑپا کی تہذیبوں کی نشو ونما کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے محمد حسن نے اسیریا، بابل اور ستھین تہذیبوں سے اس کی مماثلت پر زور دیا ہے اور اسے مدلل بنانے کے لیے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ شیو کی تین آنکھوں اور ان کے کاندھوں پر سانپ کا جو تصور ہے وہ وسط ایشیا کے مشہور شہنشاہ ضحاک سے مماثلت رکھتا ہے کیوں کہ ایسا مانا جاتا ہے کہ ضحاک کے شانوں پر بھی سانپ اُگ آئے تھے۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ قدیم ایرانی اور قدیم سنسکرت کے متعدد الفاظ اور تصورات مشترک ہیں جو دونوں تہذیبوں کی مماثلت کی دلیل ہیں۔

محمد حسن نے اردو زبان کو کھچڑی زبان سے تعبیر کیا ہے اور اس کے وجود میں آنے کی تاریخی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مورّخ کی طرح عرب

تاجروں اور حکمرانوں کے ورود ہندوستان اور استحکام حکومت کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ تجارتی کاروبار کو ہندوستان سے مغربی ایشیا، یوروپ اور بحر روم تک پھیلانے کی کوشش میں کس طرح ایک کھچڑی زبان وجود میں آئی اور ہندوستان میں مختلف علاقائی زبان ہونے کے باوجود کس طرح اس کھچڑی زبان کو مرکزیت حاصل ہوئی جو بعد میں لسانی، فکری اور تہذیبی حیثیت اختیار کرنے لگی۔ انہوں نے ان نکات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اشارہ کیا ہے کہ یہی زبان مختلف حکمرانوں سے ہوتی ہوئی مغلوں کے دور حکومت میں پہنچی۔ اس زمانے میں برج، اودھی، راجستھانی اور ناگراپ بھرنش جیسی بولیاں بولی جاتی تھیں یہ بولیاں ایک مرکزی بولی کو جگہ دینے لگی تھیں جسے ہندوی کہا جانے لگا تھا۔ اس ہندوی زبان کی نشانیاں اس وقت کے ایک مشہور صوفی شاعر امیر خسرو کے کلام میں ملنے لگی تھیں۔

محمد حسن نے اکبر اعظم سے قبل اور بعد کی مدنی مرکزیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اس دور کے دوسرے صوفی شعرا اور مفکرین مثلاً کبیر، نانک، نام دیو اور جائسی وغیرہ نے ایک مشترکہ روایت کی تصویر پیش کی اور افتراق کی جگہ اشتراک کی فکری بنیادیں تلاش کیں کیوں کہ اس وقت ایک ایسے فکری نظام کی ضرورت تھی جو مدنی مراکز میں رہنے والوں کے درمیان ''جیو اور جینے دو'' کی بنیاد بن سکے اور ان میں اپنائیت پیدا کر سکے۔ محمد حسن نے مذکورہ بالا شعرا اور مفکرین کی ''جیو اور جینے دو'' کے فلسفۂ فکر کی روشنی میں بھکتی اور اسلامی تصوف کو مذہب کی ظاہری رسم پرستی پر ترجیح دی ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اردو زبان و ادب پر بھکتی اور تصوف کے افکار کے اثرات کس طرح مرتب ہوئے۔

ہندوستان کی مدنی مرکزیت کی شکست و ریخت کا جائزہ پیش کرتے ہوئے محمد حسن نے مغلوں کے دورِ حکومت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد، مغل دربار میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور مغل شہزادے و شہزادیوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ مل کر تجارت کرنے اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستان پر انگریزوں کے قابض ہونے کی تفصیل جس طرح بیان کی اور تمام حالات کا جائزہ لیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تاریخی شعور نہایت بالیدہ تھا اور سیاسی شعور میں بھی پختگی تھی۔ محمد حسن نے بڑی تفصیل سے اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی دولت لُٹ رہی تھی، یہاں کا تجارتی نظام درہم برہم ہو رہا تھا لیکن یوروپ کی معاشی حالت بہتر سے بہتر ہو رہی تھی، ان کا نظام حکومت اور تجارت مستحکم اور مضبوط ہو رہا تھا۔ مغل حکومت کی گرفت تیزی سے کمزور ہونے لگی تھی، لٹیرے اور حملہ آور ہندوستان کے اہم مراکز پر حملے کرنے لگے تھے۔ چاروں طرف قتل و غارت، لوٹ مار اور افراتفری کا ماحول تھا۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر ہندوستان کی مدنی مرکزیت ختم ہونے لگی تھی۔ یہاں کے شاعر و ادیب اور دیگر فنکار معاشی بدحالی کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ سرپرستوں اور چھوٹے چھوٹے درباروں کی تلاش میں بھٹکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ شعرا اور ادیب اپنی جڑوں سے کٹنے لگے اور خود کو بے سروسامان اور تنہا محسوس کرنے لگے۔ ان کی شاعری میں اجتماعیت کے بجائے انفرادیت کی آواز سنائی دینے لگی۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کی تہذیبیں بھی منتشر ہونے لگیں اور شاعری کا مزاج بھی بدلنے لگا۔

محمد حسن نے اس دور یعنی 18 ویں صدی کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ''پہلا حصہ مدنی مرکزیت کی اس تلاش سے متعلق ہے جو فکری سطح پر ہو رہی تھی جس کا سرچشمہ ہندوستانی، ایرانی اور اسلامی تصوف تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے موت کے تصوّر کی تین صورتوں کی وضاحت کی ہے جس میں پہلی شکل کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ تبدیلی کی خواہش ہے جو ہر طرح کی تکلیف سے نجات دلا سکتی ہے، تسلی کی صورت پیدا کر کے زندگی کے زخم بھر سکتی ہے۔ دوسری صورت کو عدم مساوات اور سماجی بے انصافی کو دور کرنے سے تعبیر کیا ہے جو غریب اور امیر کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتی ہے۔ تیسرا وحدت الوجودی تصور ہے جس کے مطابق انسان مرنے کے بعد خالقِ مطلق سے مل جاتا ہے۔ انہوں نے ان تینوں صورتوں پر جس طرح روشنی ڈالی ہے اس سے موت کا تصور ایک تخلیقی سرچشمے کی صورت میں ابھرتا ہے جس میں زندگی کی نئی توانائیوں کی بشارت ملتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ موت کے اس تصور سے انسان دولت و کامیابی، اقتدار و قوت کے نشے سے بیدار ہو جاتا ہے اور دکھ درد کو عیش و نشاط پر اور خاکساری و کم مائگی کو غرور و تکبّر پر ترجیح دیتا ہے۔ محمد حسن نے ان خیالات کی نشاندہی اس دور کی شاعری میں کی ہے۔

دوسرے حصہ میں محمد حسن نے تہذیبی سطح پر مدنی مرکزیت کی تلاش کی ہے جس میں افراد اور معاشرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہندوستانی سماج کی خصوصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ سماج مختلف ادوار میں کئی چھوٹی چھوٹی دیہی، قصباتی اور علاقائی وحدتوں میں منقسم رہا تھا جو اپنی انتظامی

اور اقتصادی ضرورتیں خود پوری کر لیتی تھیں اور ساتھ ہی ان کی لسانی اور ادبی انفرادیت بھی قائم رہتی تھی اور کبھی کبھی مذہبی اور تہذیبی بھی۔لیکن بکھری ہوئی ان اکائیوں کو کسی ایک وحدت میں ضم کرنے کوشش ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔انہوں نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ یہ کوشش ایک طرف ہندوستان گیر مدنی مرکزیت کی تعمیر وتشکیل کی کوشش تھی تو دوسری طرف مغربی اور وسط ایشیائی تہذیبی وحدت سے ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش تھی۔اس بنا پر انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کوشش سے ایک ایسی تہذیب اور ایک ایسا ادب وجود میں آیا جس میں علاقائی رنگ بھی تھا اور ہندوستان گیر اور مغربی اور وسط ایشیائی تہذیب کا رنگ وآہنگ بھی تھا۔لیکن جیسے جیسے ہندوستان گیر اور عالم گیر تہذیب کا رنگ گہرا ہوتا گیا ویسے ویسے علاقائی وحدتوں کا خود کفالتی انداز بکھرتا اور ٹوٹتا چلا گیا۔اس لیے اس دور کی شاعری میں معاشرے کی جگہ فرد کی آواز ابھرنے لگی جس کی مثالیں ولی کی شاعری میں سب سے زیادہ موجود ہیں۔

محمد حسن نے تیسرے حصہ کو ادب کی سطح پر مدنی مرکزیت کی تلاش سے تعبیر کیا ہے جس میں ایک طرف ہندوستانی اور ایرانی عناصر کی کشمکش پر روشنی ڈالی ہے تو دوسری طرف ہندی اور فارسی اثرات کی آمیزش کی طرف اشارہ کیا ہے تو تیسری طرف دکنی اور دہلی کے ادبی ملاپ کا تذکرہ کیا ہے۔ہندوستانی اور ایرانی عناصر کی کشمکش کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کی وفات (1707ء) کے پندرہ سال کے اندر ہی دہلی کے ادبی مذاق میں تبدیلی آنے لگی تھی اور فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ ریختہ گوئی کی بھی شروعات ہوگئی تھی۔انہوں نے اس ادبی انقلاب کے رونما ہونے میں جو سماجی، سیاسی اور معاشی وجوہات کارفرما تھیں ان پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اس سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ ادبی انقلابات نئے تقاضوں کی بنا پر رونما ہوتے ہیں اور ان تقاضوں کی گونج بیک وقت سیاست سے لے کر تہذیب ومعاشرت تک سبھی شعبوں میں سنائی دیتی ہے۔محمد حسن کی تحقیق کے مطابق اس دور کا نظام ذرائع پیداوار کی راہ میں رکاوٹ بننے لگا اور سماج کا بڑا حصہ زندگی کی عام ضروریات سے محروم ہونے لگا تھا اس لیے ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جو نظام حکومت سے نئے مطالبے کرنے لگا۔یہی وہ زمانہ تھا جب امرا کا زوال ہونے لگا تھا اور ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے اجارہ داروں کا عروج بھی ہونے لگا۔اپنے علاقے اور زمین سے ان اجارہ داروں کا تعلق اس وقت کے بڑے بڑے امرا جو ایرانی اور تورانی جماعت میں منقسم تھے کے مقابلے میں زیادہ گہرا تھا۔اس لئے چھوٹے درباروں میں فارسی شعرا کا غلبہ نہیں تھا بلکہ ہندوستانیت زیادہ اور ایرانیت کم تھی۔اسی زمانے میں زراعتی بدحالی کی وجہ سے کسان نوکریوں کی تلاش میں دیہاتوں سے شہروں اور خاص کر دہلی کی طرف منتقل ہونے لگے جس کا اثر دہلی کی تہذیبی اور ادبی رجحان پر بھی پڑا۔اس لیے محمد حسن نے عام تصور کے برخلاف یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو شاعری کا رواج امرا کی قدردانی اور دربار شاہی کی سرپرستی کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ یہ عظیم تہذیبی روایت کا مظہر تھا۔لہٰذا شمالی ہندوستان میں اردو ادب کی ابتدا فارسی اور ہندی کی مشترکہ روایات کے زیر اثر ہوئی ہے۔ابتدائی دور سے اردو ادب کے نشو نما میں دونوں روایات اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ہندی عناصر کی تشکیل مختلف بولیوں اور زبانوں مثلاً کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی، میتھلی اور راجستھانی وغیرہ سے ہوئی ہے۔محمد حسن نے تذکرۂ چمنستان شعرا سے کئی اشعار نقل کیے ہیں جن میں فارسی شعرا کے اثرات موجود ہیں۔ہندی کے سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ سنسکرت کے قصے کہانیاں، اخلاقی تمثیلیں، مذہبی روایات اور فلسفیانہ تصانیف کے ترجمے جو عربی اور فارسی میں ہوئے تھے، ان کے اثرات اردو ادب میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔انہوں نے مزید وضاحت کی ہے کہ اردو ادب پر ہندی کے اثرات بھکتی کال کی شاعری کے ذریعہ مرتب ہوئے۔مختصر یہ کہ اردو ادب نے جہاں فارسی ادب سے حسن کاری، لفظوں کے دروبست، اضافت اور تراکیب، شاعرانہ لب ولہجہ اور شائستگی وشستگی کا تصور لیا وہیں ہندی شاعری سے بالواسطہ کئی چیزیں مثلاً تمثیلی پیرایۂ اظہار، عشق کے بعض تصورات، صنعت گری اور نک سک اور نائکہ بھید کے رموز سیکھے۔ہندی کے اثرات محمد شاہی دور کی اردو شاعری میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

دکنی اور دہلی کی ادبی وراثت کے ملاپ کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد حسن نے وضاحت کی ہے کہ کس طرح دہلی میں اردو شاعری کا چرچا ولی کے کلام کے دہلی آنے کے بعد سے ہوا اور کس طرح اس کے زیر اثر ریختہ گوئی کی طرف شعرا کا ذہن مبذول ہوا۔انہوں نے دکنی ادب کے نشو ونما اور پختگی حاصل کرنے کے محرکات کا جائزہ لیا اور یہ بتایا کہ دکنی ادب نے کس طرح فارسی ادب کے آب ورنگ اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔نیز انہوں نے ان اقدار کی طرف اشارہ کیا ہے جو دکنی ادب کے ساتھ دہلی آئے اور اردو شاعری کے پیکر میں سما گئے۔دکنی شاعری نے گجراتی، بیجاپور، گول کنڈہ اور دور مغلیہ کے دکنی شعرا کے کلام سے جو ذخائر حاصل کیے تھے، ان کا جائزہ لیتے ہوئے محمد حسن نے اظہار خیال کیا ہے کہ دکنی شاعری اسلوب کے اعتبار سے مربوط تھی

اوران میں مذہبی، رزمیہ اور رومانی عناصر کی افراط تھی اوران میں مقامی رنگ کا غلبہ بھی تھا۔ نیز ان نظموں تمثیلوں، مثنویوں اور قصیدوں میں کہیں اخلاقی اور مذہبی نصیحتیں ملتی ہیں تو کہیں وارداتِ حسن وعشق اور کہیں موسموں کا بیان ہے تو کہیں تقاریب کی سجاوٹیں۔ اس لیے انہیں غزل پر فوقیت حاصل ہے۔ محمد حسن کا خیال ہے کہ بھلے ہی دکنی شاعری کی یہ خوبیاں ولی کی شاعری میں پورے آب وتاب کے ساتھ موجود نہ ہوں لیکن دہلی کی شاعری میں ان کے ارتعاشات موجود ہیں۔

محمد حسن نے محمد شاہ اور شاہ عالم کے دور میں ہندوستان کی بحرانی صورت حال کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان میں تاتاریوں کے قتل عام کے بعد بغداد اور ایران کی تاریخی صورتِ حال اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ چنگیز خان اور ہلاکو نے وہاں کی حکومت اور تہذیب کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور ہندوستان میں نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، غلام قادر اور روہیلوں نے دہلی میں قتل وغارت کر کے یہاں کی سیاسی اور تہذیبی مرکزیت ختم کر دی تھی جس سے دہلی میں انتشار، ابتری، بے یقینی اور حال کی بے اعتباری کا احساس عام ہونے لگا تھا۔ اس لیے اس دور کی شاعری میں دنیا کی رنگینی اور اس کی بے ثباتی کے ارتعاشات موجود ہیں۔ محمد حسن نے ان کی مثالیں حاتم، میر تقی میر، خواجہ میر درد اور سودا کی شاعری میں تلاش کی ہیں۔

محمد حسن نے دہلی کی شاعری میں صنعت ایہام گوئی اور اس کے عروج وزوال پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور عربی، فارسی اور ہندی سے مثالیں بھی دی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ صنعتِ ایہام گوئی کی روایت ہزاروں سال پرانی ہے۔ سنسکرت میں اس صنعت کو ''شلیش'' کہا جاتا تھا۔ انہوں نے شلیش کی مثالیں کالی داس کی شاعری میں بھی تلاش کی ہیں۔ ایہام گوئی کے فائدے اور نقصانات پر اظہار خیال کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے کہ کس طرح اس صنعت سے متاثر ہو کر شعرا نے الفاظ کے پیکر تراشے اور اردو کے دامن کو عربی، فارسی اور ہندی الفاظ ومحاوروں سے مالا مال کر دیا۔ انہوں نے دہلی کی شاعری کا جائزہ لینے کے بعد اس نکتے کی بھی وضاحت کی ہے کہ اس دور کی شاعری اجتماعی زندگی سے برسرِ پیکار شخصیتوں کی شاعری نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی سے ہم آہنگ شخصیتوں کی شاعری ہے۔ لہٰذا اس دور کی شاعری کا مزاج داخلی اور انفرادی ہونے سے زیادہ اجتماعی اور مجلسی ہے۔ تصوّرات اور خواب اس دور کے مذاق کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں جنہیں شعرا خوش مذاقی اور صنعت گری کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ اس دور کے مذاق کے مطابق شعرا نے زندگی کے نشاط کو بے جھجک پیش کرتے تھے اور اپنے معاشقوں، معاملہ بندی اور امرد پرستی کا ذکر اور سراپا نگاری کرتے ہوئے نہیں شرماتے تھے۔ اس لیے اس دور کی شاعری میں سوز وگداز کی کمی ہونے کے باوجود سچی شعریت کے عناصر موجود ہیں۔ محمد حسن کا خیال ہے کہ اس دور یعنی اٹھارہوی صدی کی شاعری ایک تاریخی، جذباتی اور تہذیبی ضرورت کو پورا کر رہی تھی اور نئے درمیانی طبقے کے لیے سرمایۂ تسکیں اور اظہار کا ذریعہ تھی اور جو دربار سے الگ ہٹ کر ایک ایسی تہذیب کی نشوونما کر رہی تھی جو ہندوستانی ہونے کے باوجود ایرانی تہذیب کی شائستگی اور لطافت اپنے اندر سموئے ہوئی تھی۔

محمد حسن نے دہلی کی اردو شاعری کا جو تہذیبی اور فکری پس منظر پیش کیا ہے وہ ان کی وسعت مطالعہ اور تحقیقی وتنقیدی بصیرت کی مثال ہے۔ انہوں نے تہذیبی، سماجی، سیاسی، معاشی اور فکری پس منظر میں ادب کی تفہیم وتنقید کی اہمیت پر زور دیا ہے اس کا اطلاق دنیا کے تمام ادبیات پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی ملک کا ایسا کوئی ادب نہیں ہے جس کے نشوونما اور عروج وزوال میں اس دور کی سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی محرکات وعوامل نے اہم رول نہ ادا کیا ہو۔ محمد حسن کی یہ کتاب دہلی کی اردو شاعری سے متعلق ضرور ہے مگر اس سے ادبیات عالم کی تفہیم کی راہیں بھی روشن ہوتی ہیں۔

Residence: 262-D, Shipra Sun City, Indirapuram, Ghaziabad-201014
Mobile No: 09911796525
Website:people.du.ac.in/~aahmad